سلسلہ مطبوعات ۲

خانقاہی نظام کی اہمیت

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

سلسلہ مطبوعات ۶۲

خانقاہی نظام کی اہمیت

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

مضامین ایک نظر میں

صفحات

خانقاہی نظام کی اہمیت 5

عہد نبوی میں خانقاہ 7

سلسلہ کی اہمیت 8

خانقاہ کے عناصر ترکیبی 9

خانقاہ اور درگاہ میں فرق 11

علم کے تین درجات 13

خانقاہی تربیت 16

روحانی بادشاہت 19

جملہ حقوق بحق فاؤنڈیشن محفوظ ہیں

نام پمفلٹ : ـــــــــ خانقاہی نظام کی اہمیت

تحریر: ـــــــــ پروفیسر نثار احمد فاروقی

طبع اوّل: ـــــــــ اپریل 2006ء

ناشر: ـــــــــ شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

پوسٹ بکس نمبر 938 ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خانقاہی نظام کی اہمیت

خانقاہی نظام پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ''خانقاہ'' کیا ہے؟ اس کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، مگر ان کی تصدیق لغت اور اصولِ اشتقاق سے نہیں ہوتی۔ اتنا یقینی ہے کہ یہ لفظ مفرد نہیں مرکب ہے۔ ''خان'' منگولوں کی زبان میں بادشاہ کو کہتے ہیں۔ جب ہم ہلاکو خان یا چنگیز خان کہتے ہیں تو اس سے ان کا پٹھان ہونا مراد نہیں ہوتا، بلکہ چنگیز خان کہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم کنگ ایڈورڈ کہیں یا ٹیپو سلطان کہیں۔ اب رہا دوسرا جز ''قاہ'' تو یہ فارسی لفظ ''گاہ'' کا عربی تلفظ ہے۔ قاف اور گ کی آوازیں متبادل ہیں، مصری لہجے میں آج بھی اقـــــــول لک (میں تمہیں کہتا ہوں) کو اگـــول لک بولتے ہیں۔ اسی طرح قول کو پنجابی زبان میں ''گل'' بنالیا گیا ہے۔ تو گاہ بھی قاہ ہوگیا۔ گاہ وہی ہے جو درس گاہ، چراگاہ وغیرہ میں اسمِ ظرف مکان اور صبح گاہ وناگاہ وغیرہ میں ظرف زمان کے لیے آیا ہے۔ خانقاہ کا مفہوم آقا یا مالک یا روحانی بادشاہ یعنی مرشد کا گھر۔۔۔۔ سکھ دھرم کی اصطلاح میں گردوارہ۔ اس لفظ کی ترکیب بتا رہی ہے کہ اس کا رواج وسط ایشیاء کے علاقے سے شروع ہوا ہوگا۔ ابتدائی صدیوں میں عرب علاقوں میں یا علماء وصوفیاء کی تصانیف میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ اگرچہ بعد کے دَور میں خانگاہ کرلیا گیا۔

عرب دُنیا میں صوفیاء کے محلِ سکونت کو عموماً ''زاویہ'' کہا جاتا ہے۔ زوایا اس کی جمع ہے۔ اس کا لفظی مفہوم وہی ہے جو انگریزی لفظ Seclusion کا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرات صوفیاء کی گوشہ نشینی، اعتزالِ خلق اور حاکمانِ وقت سے بے تعلقی، تنہائی، ذکر و شغل اور مجاہدہ و

ریاضت ان سب کا پرتو لفظ زاویہ میں موجود ہے۔

دوسرا لفظ جو درویشوں کی قیام گاہ کیلئے عربی میں مستعمل ہے، وہ رباط ہے، یہ عراق میں زیادہ رائج ہے۔ رباط میں سرائے کا مفہوم ہے۔ صوفیاء کے پاس خدام و مریدین بھی رہتے تھے اور چوتھی صدی سے نویں صدی ہجری تک سیر و سیاحت بھی حصولِ علم اور کسبِ کمال کا ضروری وسیلہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس دور کے بزرگوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کثرت سے اس کی مثالیں پائیں گے کہ انہوں نے وسیع تر علاقوں کی سیاحت کی اور جہاں کہیں گذر ہوا، وہاں کے درویشوں سے ملاقات کی۔ نویں صدی ہجری کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، مگر بتدریج کم ہوتا گیا۔ چونکہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے درویش کسی شہر میں آتے تھے تو وہاں کسی بزرگ کی خانقاہ میں قیام بھی کرتے تھے، اس لیے اس کو رباط کہا گیا۔

ایک اور لفظ ''تکیہ'' ہے۔ اس کی جمع ''تکایا'' اور مفہوم ٹھکانا ہے۔ یہ عموماً قلندروں، مجذوبوں، فرقہ ملامتیہ سے متعلق درویشوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ تکیہ عموماً شہر سے باہر کسی باغ میں یا قبرستان میں یا کسی قدیم تاریخی عمارت کے ساتھ، یا سرراہ بھی بنالیا جاتا تھا۔ اس میں رہنے والا درویش نہ صاحب سلسلہ ہے نہ اس کے پاس کثرت سے جہاں گشت درویشوں کی آمد ہے۔ اس لیے اسے خانقاہ یا رباط نہیں کہا گیا۔ 'تکیہ' میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ یہ ایک طرح کا عارضی ٹھکانا ہے جو عموماً 'جھونپڑا' کچی مٹی کا مکان، یا خیمہ نما جگہ ہوتی ہے۔ مگر بعد میں یہ لفظ ادھر دکن (جنوب) میں بھی وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

جب وسط ایشیا اور مغربی ایشیاء میں تصوف ایک منظم تحریک بن گیا اور مختلف سلسلے شائع ہو گئے تو مریدوں اور مسترشدوں کی خاصی تعداد خانقاہوں میں رہنے لگی اور ان کو ''جماعت خانہ'' کہا گیا۔ یہ لفظ خود دلالت کر رہا ہے کہ ایک بڑی تعداد ہے جو کسی جگہ رہ رہی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ جماعت خانہ خانقاہ کا ایک حصہ بن گیا۔ یعنی خود خانقاہ ایک بڑا ادارہ ہے، جس کے شعبہ جات جماعت خانہ ہے، لنگر خانہ ہے، توشہ خانہ ہے اور بعض خانقاہوں میں سماع خانہ بھی ہے۔

یہ تو مختصر تشریح لفظ خانقاہ کی تھی۔ اب ایک بات اور بطور ''دفع دخل مقدر'' (مخفی اعتراض کا جواب) عرض کرتا ہوں۔ صوفیاء کے معاندین اور تصوف کے منکرین کہتے ہیں، تصوف کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ عجمیت کی آمیزش سے پیدا ہوا۔ اسلام میں نہ خانقاہ ہے نہ خانقاہی نظام ہے، نہ زاویہ ہے، نہ تکیہ ہے، جماعتِ خانہ ہے نہ رباط ہے۔ تصوف کا اسلام سے تعلق ہے یا نہیں، اس کا جواب تو بارہا دیا جا چکا ہے اور یہ آج کا موضوع بھی نہیں، پھر زیادہ تفصیل چاہتا ہے، اس لیے یہ پہلو نظر انداز کرتے ہوئے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ہمارے، آپ کے، سب کے، چھوٹے بڑے تمام صوفیاء اور درویشوں کے بھی آقا و مولیٰ، دین و دنیا کے بادشاہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس اعتبار سے منگولوں کی اصطلاح میں وہ ذاتِ گرامی خانِ اعظم بھی رہے۔

عہد نبوی میں خانقاہ:

مکہ معظمہ میں دارِ ارقم اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی آنحضرت کا محلِ سکونت تھا۔ اس لیے (مدینہ منورہ میں) پہلی خانقاہ مسجدِ نبوی ہے۔ جو کچھ صوفیاء کی خانقاہوں میں ہوتا رہا ہے، وہی سب کچھ مسجد نبوی میں بھی ہوتا تھا۔ یہ مسجد حضورِ اکرم ﷺ کا ''زاویہ'' بھی تھی، جہاں آپ رات رات بھر بیدار رہ کر عبادت و ریاضت فرماتے تھے۔ یہ آپ کا ''جماعت خانہ'' بھی تھا۔ بعض ممتاز اصحاب کے گھر بھی مسجد سے متصل تھے اور صحابہ کی ایک جماعت ہمہ وقت مسجد میں حاضر رہتی تھی۔ یہی مسجدِ نبوی رباط بھی تھی کہ باہر سے آنے والے وفود یہیں آپ سے ملاقات کرتے تھے اور بعض کا مسجد ہی میں قیام بھی ہوتا تھا۔ اسی مسجد میں تکیہ بھی موجود تھا، اصحابِ صفہ سے بڑا قلندر اور کون ہوگا؟ اُنہوں نے مسجد ہی کے ایک چبوترے کو اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ غرض کوئی صفت ایسی نہیں جس کا نمونہ اور مثال مسجد نبوی ﷺ میں نہ ملتی ہو۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسجدِ نبوی اسلام کی پہلی خانقاہ تھی۔

حضورِ اکرم ﷺ اس میں مرشدِ اعظم تھے اور آپ کے اصحاب مریدین تھے، جنھوں نے باقاعدہ بیعت کی تھی اور وہ حضور سے دن رات روحانی استفادہ کر رہے تھے۔ صوفیاء کی خانقاہوں میں ایک مجاہدہ کرنے والے کو جو بات ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں حاصل ہوتی۔

اصحابِ رسول کو وہ مقام تو رسول اکرم ﷺ سے مواجہہ (روبرو) شریف میں صرف کلمہ دہرانے سے ہی مل جاتا ہے۔

سلسلہ کی اہمیت:

اب ذرا یہ غور فرمائیے کہ ''سلسلہ'' کیا ہے؟ سلسلہ کے لغوی معنی ہیں زنجیر۔ مسلسل وہ چیز ہے جس میں زنجیر کی طرح کڑی سے کڑی جڑی ہوتی ہے۔ کسی زنجیر سے درمیان میں ایک حلقہ غائب کر دیجیے تو اس کا تسلسل ٹوٹ جائے گا، زنجیر کے دو ٹکڑے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے جو دین مکمل ہو کر ہم تک پہنچا ہے، وہ بھی آپ کا ایجاد کردہ نہیں بلکہ حضور ﷺ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ زنجیر بھی کہیں تو جا کر ختم ہوتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی سیرۃ طیبہ کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور انہیں المبتداء والمبعث والمغازی کہا گیا ہے۔ پہلے حصے المبتداء کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے اور پھر ہر عہد کے انبیاء اور رسولوں کا بیان ہوتا ہے۔ ایمانِ مفصل میں یہ ہے کہ **آمنت باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ** ۔ یعنی ہم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اور **لا نفرق بین احدمن رسلہ**.(البقرۃ ۲۸۵)اس کے رسولوں کے درمیان چھوٹے بڑے کا فرق و امتیاز کرنا یا ایک کو ماننا دوسرے کو نہ ماننا یہ ہمارا کام نہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں سے ہمارا اختلاف اس تحریف و تصحیف و تبدل و تغیر کی وجہ سے ہے جو انہوں نے صحائفِ آسمانی اور شریعتِ الٰہی میں کر رکھی ہیں۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہمارے ایمان کی نوعیت یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا منکر ہو کر ایک موسوی یہودی اور ایک عیسائی نصرانی رہتا ہے۔ مگر موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا انکار کر کے ایک مسلمان، مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ ان پر ایمان لانا از روئے نصِ قرآنی فرض کیا گیا ہے۔

یہ بات قدرے تفصیل سے میں نے یوں عرض کی کہ ہمارے رسول ﷺ ایک سلسلہ

نبوت سے وابستہ ہیں، اور اس کی آخری کڑی ہیں۔ جو لوگ آخری کڑی کے منکر ہوں، وہ دوسری کڑی جوڑ کر دکھا دیں۔ سینکڑوں لوگوں نے پچھلے ۱۵ سو برسوں میں دعوے نبوت و رسالت کیا ہے۔ آج ان کے نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ وقت کا سیلاب سب کو بہا کر لے گیا۔ جو آج ایسا دعویٰ کر رہے ہیں، وہ بھی خود کو سلسلہ نبوت سے جوڑ نہیں سکے، صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا خود ایک سلسلہ ہے اور وہ سلسلہ نبوت ہے۔ سارے اصحاب آپ کے مرید اور آپ سے تربیت یافتہ تھے۔ اب نبوت ختم ہوگئی تو سلسلۂ ولایت حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا، وحی کا نزول بند ہوا تو کشف والہام کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اللہ کہتا ہے کہ اس سے وہی شفاعت کر سکتا ہے، جسے اللہ اذنِ شفاعت دے دے۔ من ذاالذی یشفع عندہ الاباذنہ (البقرۃ: ۲۵۵) اور یہ اذن ہمارے آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر جس نے بیعت کی وہ یقیناً آپ کی شفاعت کا حقدار ہے، اب آج کے زمانہ تک ایک شخص کا دوسرے سے بیعت کرنا گویا ایک زنجیر بنا دیتا ہے جس کا ہر حلقہ دوسرے حلقے سے جڑا ہوا ہے۔ میرے پیر و مرشد امور دین و دنیا میں میری رہنمائی فرمائیں گے۔ اور قیامت میں ان کا دامن میرے ہاتھ میں ہوگا اور ان کا ہاتھ اپنے مرشد کا دامن پکڑے ہوگا۔ اسی طرح یہ سلسلہ رسول اکرم ﷺ تک پہنچے گا۔ گویا یہ زنجیر ولایت، سلسلۂ نبوت سے جا ملے گی۔

خانقاہ کے عناصر ترکیبی:

اس تمہید کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ خانقاہی نظام کیا ہے، اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں اور یہ کیا کرتی تھی یا یہاں کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی قدس سرہ نے فرمایا کہ خانقاہ کیلئے تین چیزیں درکار ہیں، حال، قال اور مال۔ حال تو یہ ہے کہ پورا سلوک طے کیا ہو اور علومِ باطنی کے رموز و وقائع مرشد کی شخصیت کے آئینے میں نظر آنے لگیں۔ قال سے مراد علومِ ظاہری ہیں یعنی وہ مرشد کتابی علم

بھی رکھتا ہو۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول عقائد وغیرہ سے باخبر ہو، تا کہ دوسروں کو غلط راستہ نہ دکھائے اور مال کی ضرورت اس لیے ہے کہ زیرِ تربیت مریدوں کے ضروری خرچ پورے ہو سکیں۔ محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کی جا سکے۔ پھر خود ہی حضرت چراغ دہلویؒ نے فرمایا کہ قال اور مال کی بھی چنداں ضرورت نہیں، البتہ ''حال'' چاہیئے۔ یہ بنیادی عنصر ہے جس کے باطن کی خود تربیت نہیں ہوئی ہے۔ وہ دوسروں کی اصلاح کیا کر سکتا ہے؟ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہ کا ایک دوہا پنجابی زبان کا جواہر فریدی میں ہے اور یہ سکھوں کی کتابِ مقدس ''گرنتھ صاحب'' میں بھی آیا ہے، فرماتے ہیں:

ٹوپی لیندے باورے، دیندے کھرے نِلج
چوہا بِل نا مانوے پچھے بندھتے چھج

کسی کو مرید کرتے ہیں تو صوفیاء ''کلاہ'' (ٹوپی) عطا کرتے ہیں، بابا صاحب فرماتے ہیں کہ جو کسی سے بیعت کر کے کلاہِ ارادت لیتے ہیں وہ باولے ہیں، اور جو دیتے ہیں وہ نرے بے غیرت ہیں۔ کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ چوہا خود تو بِل میں سما نہیں رہا ہے اوپر سے اس نے اپنی دم کے ساتھ چھاج بھی باندھ لی۔ یعنی اپنی ہی نجات و مغفرت یقینی نہیں ہے تو دوسرے کی نجات کا ذمہ کیا لیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بابا صاحب نے ان عقبیٰ فروش (آخرت فروشوں) صوفیوں کیلئے کہی ہے جو صاحبِ حال نہیں ہیں اور جنھوں نے تصوف کی دکان کھول رکھی ہے۔

سب سے پہلے زوال ''قال'' کا ہوتا ہے یعنی علومِ ظاہری سے بے بہرہ رہ گئے۔ نہ قرآن کی خبر ہے، نہ حدیث سے واقفیت ہے، نہ مسائل شرعیہ کی سمجھ بوجھ ہے تو ظاہر ہے کہ اخلاق و کردار میں کمزوری آئے گی اور وہ کمزوری باطنی کیفیات پر اثر انداز ہو کر ''حال'' کو پہلے پژمردہ پھر بالکل مردہ کر دے گی۔ تین عناصر میں سے حال اور قال کا تعلق امورِ دینی سے تھا۔ یہ نہ رہ سکے تو دین رخصت ہوا۔ تیسرے عنصر مال کا تعلق دنیا سے ہے۔ حال اور قال کے جانے کے بعد یہ بڑھ

بھی جاتا ہے۔ اس لیے کہ اب اس کا حریف تو کوئی رہا نہیں، حال ہوتا تو وہ ترک وتجرید وتفرید (حُبِّ دنیا سے دوری) وقناعت وتوکل وغیرہ کی طرف دھیان دیتا اور مال کو مبغوض رکھتا۔ اب کوئی احتساب کرنے والا نہیں تو مال ہی مال کر دیتا ہے۔ اسی لیے خانقاہ ہیں بند ہوتی گئیں، درگاہیں کھلتی گئیں، جن میں بعض تو فرضی بھی ہیں۔

خانقاہ اور درگاہ میں فرق:

خانقاہ اور درگاہ میں کیا فرق ہے؟ اس کو بھی مختصراً عرض کر دوں۔

خانقاہ میں ایک زندہ پیر موجود ہے، جسے کسی مرشد سے باطنی سلوک کی تعلیم ملی ہے۔ اس نے ذکر وشغل سے اپنے قلب کو آئینہ جمالِ الٰہی بنالیا ہے، اُن راہوں کا عرفان حاصل کرلیا ہے، جن پر چل کر حقیقتِ اعلیٰ کو پایا جاسکتا ہے۔ اپنے اخلاق وکردار کو شریعتِ محمدی کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ اب وہ بندگانِ خدا کو فیض پہنچانے اور ان کے باطن کو پاکیزہ بنانے کیلئے خانقاہ کے دروازے کھول کر بیٹھا ہے۔ تشنگانِ معرفت (معرفت کے پیاسے) جویائے حقیقت (حقیقت کے متلاشی) اور طالبانِ معرفت آرہے ہیں۔ ان کے ذوق اور استعداد اور حوصلے کے مطابق انہیں فیض پہنچا رہا ہے۔

اس خانقاہ میں مساکین وفقراء کی پناہ گاہ بھی ہے، ان کی ضروریات پوری ہورہی ہیں، بیماروں اور دردمندوں کا علاج بھی ہے، درماندہ وبیکس انسانوں پر شفقت ورافت بھی ہے۔ اہل احتیاج کی حاجتیں پوری کی جارہی ہیں۔ ایک طرف لنگر خانہ کھلا ہوا ہے تو دوسرے گوشے میں مسند درس بھی بچھی ہوئی ہے او کتاب پڑھائی جارہی ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جو اجودھن گئے اور حضرت بابا فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں رہے تو اُن سے ابوشکور سالمی کی کتاب ''التمہید فی بیان التوحید'' پوری پڑھی۔ بابا صاحب نے انہیں آخر میں اس کا اجازت نامہ لکھ دیا۔ جو سیر الاولیاء میں موجود ہے اور اس میں یہ تاکید کی کہ وہ بھی اپنے مریدوں کو اس کتاب کا درس دیں اور اس کا اہتمام کریں کہ کتاب کے متن میں کسی طرح کی تصحیف وتحریف نہ

ہو۔ التمہید اصول عقائد کی بہترین کتاب ہے۔ یہ عربی میں ہے اور ۱۲۲۹ھ میں ایک بار مطبع غریب حصار سے شائع بھی ہوئی تھی، اب بہت کمیاب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے چشتی بزرگوں کے عقائد کیا تھے۔ بعد میں بے علم عقیدت مندوں نے اپنے عقائد کو ان بزرگوں سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔

یہ بات حتمی طور پر ثابت ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے عقائد وہی تھے جن کی تشریح ابوشکور سالمی کی کتاب میں ملتی ہے۔ ان عقائد پر کاربند رہنے اور اپنے مریدوں کو تلقین کرنے کی بھی انہوں نے اپنے خلیفہ و جانشین حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کو تاکید کی۔ تصوف میں ارادت کا نام ''اتحاد مطلب'' (مقصد میں ہم آہنگی) اور اتباع کامل کے سوا کچھ نہیں، تو وہی عقائد یقیناً حضرت محبوب الٰہیؒ کے بھی تھے اور وہی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے عقائد بھی رہے، جو اُن کی تصانیف سے ثابت ہیں۔ اور ''سلسلہ'' اسی کا نام ہے اگر کسی مرید کا عقیدہ اپنے پیر و مرشد سے منحرف ہو گیا تو وہ مرید رہتا ہی نہیں، بقول مولانا روم ''مُرید'' ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان بزرگوں کی تصانیف میں اگر کوئی بات اجنبی نظر آئے تو اسے فوراً ان کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ پوری تحقیق اور چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔ کتابوں میں اضافہ اور الحاق ہمیشہ ہوا ہے۔ کتابوں کیا، احادیثِ نبوی ﷺ میں ہوا ہے۔ حدیث کے مقابلے میں ملفوظات و تصانیفِ صوفیہ تو بہر حال کمتر درجے کی چیز ہیں۔

یہ ذرا سی گفتگو عدالتی اصطلاح میں بے جوڑ (Irrelevant) ہو گئی۔ مگر کچھ ضرورت پوری ہو سکے تو تھوڑا سا بہک جانے میں بھی مضائقہ نہیں۔

خانقاہ میں سب سے بڑا اور بنیادی کام تعلیم و تربیت کا تھا۔ تعلیم علومِ ظاہری کی، علومِ باطنی اور علومِ نافعہ کی، باطنی تعلیم میں (Practicals) پر زیادہ زور تھا، کہ تصوف ریسرچ کرنے کی چیز نہیں۔ یہ چاہتا ہے کہ آپ Search کریں۔ ریسرچ کو علماء ظاہر کیلئے چھوڑ دیں۔

درگاہوں سے یہ سب کیفیات اٹھ گئیں۔ بقول اقبال

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی پوری زندگی تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، تزکیہ و تربیت، ارشاد وہدایت میں گزری، مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ حضرت بندہ نواز کی تدفین کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت سید اصغر حسینیؒ مسندِ درس پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور کتاب پڑھانی شروع کر دی تھی۔ صرف اس چھوٹی سی بات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ خانقاہی نظام میں اور بندہ نواز کے طریقِ سلوک میں تعلیم کو کتنی اہمیت حاصل تھی کہ اسے ایسے وقت بھی ملتوی نہیں کیا گیا۔

یہ تعلیم جو خانقاہ میں ہوتی تھی، اس میں اور دنیا بھر کے تعلیمی اداروں اور مدارس کی تعلیم وتدریس میں فرق کیا تھا؟ مدارس میں جو علم پڑھایا جاتا ہے وہ علم کے قشور یا چھلکے ہیں، ان سے یہ ہوتا ہے کہ انسان کی جہالت و بہیمیت ظاہر سے دور ہو جاتی ہے مگر باطن کے گوشوں میں چور بن کر چھپ جاتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ عالم ہوتا ہے مگر اسے ایک ''مستند جاہل'' سمجھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ وہ حقیقتِ اشیاء سے باخبر نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ سیب کی ہزاروں قسموں سے واقف ہوں۔ اس کی ساری نباتیاتی خصوصیات کا بھی علم رکھتے ہوں، یہ بھی جانتے ہوں کہ سیب میں شکر کتنی ہے، لوہا کتنا ہے، وٹامن کون کون سے ہیں، وغیرہ۔ خود کبھی سیب کھایا نہ ہو، تو اس سارے علم کا اعتبار کیا ہے؟

خانقاہی نظام کا علم حق الیقین تک پہنچاتا ہے، حقیقت الحقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں علم کے ساتھ عمل بھی ہے۔ علماء جو کچھ جانتے ہیں، صوفیا اس کو عمل میں برت کر دیکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں۔ اس لیے ان کا تھوڑا علم بھی انہیں مکنونات واسرار (مخفی گوشوں) تک پہنچا دیتا ہے۔

علم کے تین درجات:

مشائخ کا قول ہے کہ علم کے تین درجے ہیں اور ان کی طرف قرآنِ کریم میں تین نہایت حقیر حشرات الارض کے نام سے لے کر اشارہ کر دیا ہے۔ علماء اسے تفسیر بالرای کہا کریں مگر

ان لطافتوں کی طرف ایک صوفی کی نگاہ ہی جاسکتی ہے۔علم کے پہلے درجے کا رمز ایک حقیر، بظاہر ہمارے لیے بے فیض کیڑا عنکبوت یعنی مکڑی ہے جس سے قرآن کریم کی ایک سورۃ بھی موسوم ہے۔ یہ کیڑا اپنے لعاب سے ایک جال بناتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ اپنا رزق حاصل کر سکے۔ دوسرے کیڑے مکوڑے اس میں آ کر پھنس جاتے ہیں اور عنکبوت کی روزی روٹی چلتی رہتی ہے، یہ وہ علم ہے جو روزی کمانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔اسے قرآن کی اصطلاح لے کر عنکبوتی علم کہا جاسکتا ہے اور قرآن نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ "ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت". (العنکبوت: ۴۱) سب سے بودا اور ناپائیدار گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔یہی حال عنکبوتی علم رکھنے والوں کا ہوتا ہے۔جس کا خلاصہ اکبرالہ آبادی نے یوں بیان کر دیا ہے:

کیا کہوں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

ایک ہی مصرعہ میں عنکبوتی علم کی ساری روداد آ گئی۔

علم کا دوسرا درجہ جسے قرآن سے ایک علامت مستعار لے کر بیان کیا جاسکتا ہے، وہ نملی علم ہے۔نمل کے معنی ہیں چیونٹی، اور اس سے بھی قرآن کی ایک سورۃ موسوم ہے۔چیونٹی کیا کرتی ہے؟ سخت محنت، دور دور سے ذرہ ذرہ غذا جمع کر کے اپنے مسکن میں رکھتی ہے تاکہ برسات میں بھوکی نہ مرے اور وقتِ ضرورت یہ غذا اس کے کام آئے۔جو لوگ محقق اور ریسرچ اسکالر کہلاتے ہیں، حوالے کی کتابیں لکھتے ہیں، ادھر ادھر بکھری ہوئی معلومات کو یکجا کر کے کسی موضوع پر خود کتاب لکھتے ہیں یا دوسرے لکھنے والوں کی مدد کیلئے مواد جمع کر دیتے ہیں۔ان کے علم کی مثال مشائخ کے نزدیک چیونٹی کی ہے اور ان کا علم نملی علم ہے جو وقت ضرورت کام آتا ہے کہ آپ کو کسی لفظ کے معنی کی تلاش ہے تو ڈکشنری میں دیکھ لیا۔کسی کے سوانح حیات معلوم کرنا ہیں تو تذکرہ وسیرۃ کی کتابوں سے مدد مل گئی۔یہ علم بہرحال عنکبوتی علم سے اچھا ہے۔ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اسی علم میں آسکتے ہیں۔

علم کا تیسرا اور اعلیٰ درجہ وہ ہے جسے صوفیاء نے ''نحلی علم'' کہا ہے۔ قرآن کریم میں ایک سورۃ النحل بھی ہے۔ نحل شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ وہ کیا کرتی ہے؟ پھلوں اور پھولوں سے ذرہ ذرہ رس چوستی ہے اور اسے شہد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ شہد کو اتنا پاک اور پاکیزہ رکھتی ہے اگر کوئی شہد کی مکھی کسی گندی جگہ غلطی سے بیٹھ کر آ گئی ہے تو اس کے چھتے میں ایسی مکھیاں بھی دروازے پر پہرہ دیتی ہیں جو وہیں اس کے دو ٹکڑے کر کے پھینک دیتی ہیں۔ یہ ہماری عام گندی مکھی کبھی شہد پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کتے کے سامنے شہد ڈالیے تو دور سے سونگھ کر چھوڑ دے گا۔ یہ اس کی پاک اور نفاست کا قدرتی انتظام ہے۔ قرآنِ کریم نے شہد کی مکھی کیلئے ہی کہا ہے "واوحی ربک الی النحل (النحل: ٦٨) اور اللہ نے شہد کی مکھی پر وحی بھیجی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب نہیں بھیجتا۔ قرآن کی اصطلاح یہ ہے کہ جب زمانہ ماضی و حال و مستقبل تینوں کا احاطہ کرنا ہو تو ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ جیسے کان اللہ علیما حکیما. اللہ جاننے والا اور حکمت والا تھا۔ اس کا یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ اب اللہ علیم و حکیم نہیں ہے، پہلے کبھی تھا۔

تو شہد کی مکھی پر آج بھی وحی کا نزول ہوتا ہے۔ اب وہ کیا وحی ہے؟ یہ اللہ جانے یا شہد کی مکھی جانے۔ پھر شہد کیلئے قرآنِ کریم نے صاف الفاظ میں فرمایا وفیہ شفاء للناس۔ اس میں لوگوں کیلئے شفا ہے۔ للناس کہہ کر ساری بشریت کا احاطہ کر لیا گیا۔

صوفیاء کے نزدیک علم کا اعلیٰ ترین درجہ ''نحلی علم'' ہے جو علومِ ظاہری کو عرفان کے شہد میں بدل دیتا ہے۔ پھر وہ عرفان ایسا پاک اور پاکیزہ ہوتا ہے کہ جہلا اور کور مغز اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔ جیسے کتا شہد نہیں کھا سکتا۔ اور اس عرفان میں روحانی صلاح و فلاح بھی ہے جیسے شہد میں شفاء للناس ہے اور اس علم کے حاصل کرنے پر کشف و الہام کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ انسانوں پر وحی کا نزول بند ہو چکا ہے اور ان کیلئے اب الہام ہی نائب وحی ہے۔

خانقاہی نظام میں دی جانے والی تعلیم یہی نحلی علم پیدا کرتی تھی۔ اسی کی لطافت، نفاست، دقیقہ شناسی اور نکتہ رسی (باریک بینی اور گہرائی) کا کچھ اندازہ ان بزرگوں کے ملفوظات کا

گہرا مطالعہ کرنے سے ہوسکتا ہے۔ یہ خانقاہی علم عملی تربیت کے شانہ بشانہ چلتا تھا۔ تربیت کے فوائد حاصل کرنے کیلئے بنیادی ضرورت ادب کی ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں: التصوف کله ادب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث کرنے سے پہلے اللہ نے زیورِ ادب سے آراستہ کیا تھا۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے: ادبنی ربی فاحسن تادیبی۔ مجھے میرے رب نے ادب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا۔ اس تادیب کے بعد ہی قرآنِ کریم یہ کہہ سکتا تھا کہ انک لعلی خلق عظیم۔ (القلم: ۴) اے نبی آپ یقیناً عظیم تر اخلاق کے حامل ہیں۔ اور جب کوئی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اخلاقِ نبوی ﷺ کے بارے میں سوال کرتا ہے تو وہ فرماتی ہیں: خلقه القرآن۔ ان کا اخلاق قرآن ہے۔ یعنی جو کچھ قرآن میں ہے، وہ سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ اور اخلاق و کردار میں موجود تھا۔

خانقاہی تربیت:

خانقاہی نظامِ تربیت یہ کہتا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا نفس ہے۔

بقول سعدی:

مردم از دست غیر می نالند
سعدی از دست خویشتن فریاد

یہ نفس خواہشوں کا منبع ہے اور اس کا مغلوب کرنا ہی سب سے زیادہ دشوار ہے۔

ذوق دہلوی کے لفظوں میں:

ننگ و اژدھا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا

مشائخ نفس کو مارتے ہیں اور قلب کو زندہ کرتے ہیں۔ تصوف نے جتنا شخصی تجربے پر زور دیا ہے۔ عہد حاضر کا علم نفسیات ابھی اس کے مبادیات کو بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ صوفیاء ہمارے اعمال کے اسرار تک پہنچ جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پہلا درجہ خطرے کا ہے۔ خطرہ وہ خیالات ہیں

جو ہمہ وقت ذہنِ انسانی میں گردش رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے قلب میں یہ خطرہ گزرتا ہے کہ وہ چوری کرے، اب وہ چوری کرنے کے ارادے سے کسی گھر کا رخ کرتا ہے۔ یہ عزیمت یا Determination ہے اور یہ دوسری منزل ہے اور اس اسٹیج تک یہ Cognizable نہیں ہے، جسے تعزیراتِ ہند کی اصطلاح میں ''قابلِ دست اندازیٔ پولیس'' کہا جاتا ہے، نہ اسے ہمارا عرفی قانون پکڑ سکتا ہے، نہ اس سے شریعت تعارض کر سکتی ہے۔ تیسرا مرحلہ وہ آتا ہے جب یہ خطرہ قوت سے فعل میں آ جائے۔ یعنی جو شخص چوری کرنے کی نیت سے نکلا تھا، وہ کسی کا سامان چرا لیتا ہے۔ اب اسے قانون بھی پکڑے گا، شریعت بھی اس پر حد جاری کرے گی۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ ''گر بہ کشتن روزِ اول''۔ دل میں ایسا خطرہ بھی کیوں گزرا؟ اس پر ہی گرفت کرتے ہیں۔ خطرات کو دل سے دور کرنے کیلئے ہی ذکر و شغل تجویز کیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے ذہن و قلب میں اللہ کے سوا اور کسی کا گزر ہی نہ ہو۔ جسے مراقبہ کہتے ہیں وہ نگرانی اور چوکیدار ہے کہ اپنے نفس و قلب پر ہمہ وقت نظر رکھی جائے۔ کوئی ناپسندیدہ خیال گھسنے نہ پائے۔ جب اپنا قلب ایسے خطرات سے پاک ہو جاتا ہے تو اس کی حالت اس آئینے کی سی ہو جاتی ہے کہ جو چیز سامنے آئے وہ اس میں منعکس ہو جائے۔ صوفیہ کے ملفوظات میں ایسے ہزاروں واقعات مل جائیں گے کہ حاضرینِ مجلس نے کسی بات کو سوچا اور شیخ نے اسی موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ منکرینِ تصوف کہتے ہیں کہ علمِ غیب اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں، مگر یہ علمِ غیب نہیں ہے۔ کشفِ قلب یا کشفِ خواطر ہے اور اس کی مثال وہی آئینے اور عکس والی ہو سکتی ہے۔ شیخ کا اپنا قلب تو مصفا و مجلا ہو چکا ہے، اس میں نہ کینہ ہے نہ کدورت۔ ہر طرح کے زنگار سے پاک ہو چکا ہے۔ اب اس کے سامنے جو بھی کشف شئے آئے گی وہ اس کا عکس آئینہ قلب میں دیکھے گا۔ اسی سے توجہ باطنی کا فلسفہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ نقشبندی سلوک میں توجہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک کامل نقشبندی شیخ کسی طالب علم کو سامنے بٹھا کر یا وہ غائب ہے تو اس کا تصور کر کے اس کے سارے احوال و مقدمات کو چشمِ باطن سے دیکھ لیتا ہے۔

چشتی سلوک میں سب سے اعلیٰ مقام عشق کا ہے۔ عشق کو صوفیہ نے اور شعراء نے بھی آگ سے تشبیہہ دی ہے۔ جگر مرادآبادی کہتے ہیں:

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کا شعر ہے:

شائد اِسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی سینے کے اندر لگی ہوئی

کسی گھر میں آگ لگ جائے تو سب کچھ بھسم کر دیتی ہے۔ انسان کے خانہ دل میں بھی شہوات و خواہشاتِ نفسانی، حسد، کینہ، بغض، طمع، غضب، مکر و حیل وغیرہ کاٹھ کباڑ کی طرح بھرے ہوئے ہیں اور اس کے خیالات انہیں میں الجھے رہتے ہیں۔ چشتی صوفیہ آتش عشق سے یہ سب خس و خاشاک پھونک دیتے ہیں، خانۂ دل کو ویرانۂ دل بنا دیتے ہیں۔

صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تا مہر دگر سکے نروید ہرگز

اب اس میں اور کسی کی محبت کا بیج پنپ نہیں سکتا۔

محبت اک جاذبہ ہے، اس میں کشش ہے۔ محبّ کا دل محبوب کی طرف اس طرح کھنچتا ہے جیسے لوہا مقناطیس سے بے اختیار لپٹ جاتا ہے۔ چشتی بزرگ کہتے ہیں کہ اس کائنات کی اساس بھی ''عشق'' ہے۔ کائنات میں اربوں کھربوں ستارے ہیں۔ ان میں سے بعض سورج سے بھی کئی لاکھ گنا بڑے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو جاذبہ عشق ہی سے سنبھالے ہوئے ہیں، اگر یہ جاذبہ چند سیکنڈ کیلئے بھی مفقود ہو جائے تو نظامہائے شمسی کے ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم ہو جائیں۔ گویا مشائخ چشت نے قوامِ کائنات (کائنات کی اساس) کا بھید بھی پالیا ہے۔ ایک ایسی شخصیت جو عشق کو مدارِ کائنات سمجھتی ہو اور خالق کائنات سے عشق کا رابطہ رکھتی ہو، وہ مخلوق سے

نفرت نہیں کرسکتی۔اسی لیے صوفیہ کا مسلک محبت، رواداری، ہم آہنگی، اخوت ومساوات اورانسان دوستی کا مسلک ہے۔

انسان دوستی اسلام کی بھی بنیادی تعلیم ہے۔اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اوران کے پتلے میں روح پھونکی ونفخت فیه من روحی. (الحجر: ۲۹) اورفرشتوں کوحکم دیا کہ وہ آدم کوسجدہ کریں۔انسان کی تخلیق بھی بہترین انداز ے پر کی گئی۔لقدخلقنا الانسان فی احسن تقویم. (التین: ۴) اسے زمین پراپنا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا۔اذقال ربک للملائکة انی جاعل فی الارض خلیفة. (البقرة: ۳۰) قرآن وحدیث سے ایسے بہت سے شواہدمل سکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عظمتِ انسان کا جوتصور دیا ہے وہ اور کسی مذہب میں موجودنہیں ہوسکتا۔اس لیے اسلام کے بنیادی اصول میں رواداری بھی شامل ہے۔مذہب کے اختلاف کا معاملہ یہ ہے کہ قدتبیّن الرشد من الغی. (البقرة: ۲۵۶)

اسلام کہتا ہے کہ نوروظلمت میں واضح امتیاز کردیا گیا ہےاورانسان کواختیارِتمیزی دیا گیا ہے، وہ جس راستے کو چاہے اختیار کرے، کسی کو کسی خاص عقیدے کی پیروی کیلئے مجبورنہیں کیا جاسکتا۔لااکراہ فی الدین. (البقرة: ۲۵۶) دین میں کوئی زورزبردستی نہیں ہے۔

روحانی بادشاہت:

اسلام کی تعلیم کوعلماء نے لفظی تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے،صوفیاء نے اس کی روح کو سمجھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ علمائے ظاہر کا کبھی عوام سے گہرا رابطہ نہیں رہا، وہ صرف اہلِ مدرسہ میں مقبول رہے ہیں۔مگرصوفیاء نے اپنا رشتہ عوام سے قائم رکھا ہے۔اُن کے دُکھ درد کو، مسائل اور وسائل کو سمجھا ہے۔اسی لیے پچھلی صدیوں میں دو بادشاہتیں متوازی چلتی رہی ہیں۔کائنات روح اور مادے کا مرکب ہے، انسان کے بھی یہی دو پہلو ہیں جسم اور روح۔بادشاہ زمین فتح کرتے ہیں، مادّی وسائل پر قبضہ واقتدار حاصل کرتے ہیں۔زروجواہر کے خزانے جمع کرتے ہیں، یہ سب مادّی اشیاء ہیں۔صوفیاء اقلیم روحانی کے بادشاہ ہیں۔ان کا سکّہ دِلوں پر جمتا ہے، ان کی حکومت

قلب و روح پر ہوتی ہے۔ اسی لیے درویشوں کو بھی ''شاہ'' لکھا جاتا ہے۔ ان کی شاہی مادی بادشاہی سے زیادہ پائیدار اور حقیقی ہوتی ہے۔ دیکھ لیجئے کہ اس علاقے میں ہی چھ سو سال میں کتنی حکومتیں آ کر چلی گئیں، کیسے کیسے دبدبے والے حکمران ہوئے۔ آج وہ منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور کوئی اُن کا نام بتانے والا بھی نہیں، مگر چھ سو سال سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز قدس سرہ کی روحانی حکومت اسی جاہ وجلال کے ساتھ باقی ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشان است
مئے ومیخانہ با مہر و نسان است

اور انشاء اللہ اسی طرح یہ پھریرا لہراتا رہے گا، مادی بادشاہتوں کا تمسخر اُڑاتا رہے گا۔

لیکن اب ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ مستقبل کی طرف دیکھنا ہے۔ ڈھائی سو سال سے مسلمان منزلِ زوال سے گزر رہا ہے۔ ہر میدان میں انحطاط Degeneration ہے۔ اب کوئی غزالیؒ، کوئی ہجویریؒ، کوئی گنج شکرؒ، کوئی محبوبِ الٰہیؒ، کوئی چراغ دہلویؒ اور کوئی بندہ نواز گیسو درازؒ جیسی شخصیت نکل کر سامنے نہیں آئی۔ اس لیے مدارس ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔ تعلیم کا رشتہ تربیت سے توڑ دیا گیا۔ اخلاقیات کی کتابوں کو درس سے خارج کر دیا گیا۔ فرضی مبہم غیر مفید اور غیر تاریخی داستانیں بچوں کو پڑھائی جانے لگیں، خانقاہیں بند ہو گئیں، دین سے واقفیت کا پارہ صفر کے درجے پر آ گیا۔ ''موئے پر سو درے'' یہ ہوئے کہ خود علمائے ظاہر نے عقائد میں کھنڈت ڈال دی اور اپنے عقائد کو اسلاف سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ذہنی پراگندگی اور انتشار پیدا ہونے لگا۔ آج جو حالات ہیں، ان سے کوئی بھی ذہین اور دور اندیش انسان مستقبل کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی ادارہ اسلامی تعلیمات کی حرمت اور مسلم تہذیب کی شناخت کو باقی رکھ سکتا ہے تو وہ خانقاہ ہی ہو سکتی ہے۔ تاریخ اسلام میں سب سے بڑا فتنہ تاتار کا حملہ تھا۔ جسے شیخ سعدی نے دیکھا تھا اور پکار اٹھے تھے۔

آسماں را حق بود گر خوں ببار بر زمیں
برزوال ملک مستعصم امیر المومنین

اس فتنے کا مقابلہ نہ علماء کر سکے، نہ فوجیں کر سکیں، اس پر غلبہ پایا تو ان گدڑی پوش فقیروں نے جنھوں نے ہلاکو خان کے پوتے کو اسلام کی طرف راغب کر دیا اور پھر لاکھوں منگول اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ تا آنکہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی۔ جس کا ایک ضمیمہ سلطنتِ آصفیہ بھی تھی۔ اس کی شان وشوکت ہم میں سے بہتوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوگی۔ غور کیجئے تو یہ سب بھی صوفیہ کا صدقہ تھا۔

ہندوستان میں خانقاہی نظام کا احیاء آج بھی وہی نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مشائخ صوفیہ نے خلافتِ عباسیہ کے نہایت شاندار زمانے میں، جو تاریخِ اسلام میں سب سے زیادہ خوش حالی کا عہد تھا، فقر وفاقہ، صبر وتوکل، زہد وقناعت اور تسلیم ورضا کی زندگی اختیار کر کے اس عہد کی عیش کوشی، اور فسق وفجور کا مقابلہ کیا تھا، اور ذی ہوش طبقے میں زہد وتقوی کا شعور جگایا تھا۔

بعد کی صدیوں میں حاکمانِ وقت کے ظلم وزیادتی کا مقابلہ کیا اور عوام کی پشت پناہی کی، جاگیرداری نظام میں عوام کا براہِ راست رابطہ حاکمانِ وقت سے نہیں ہوتا تھا، وہ دربار میں بار نہیں پا سکتے تھے مگر خانقاہوں کے دروازے ان پر ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ جو کچھ وہ مادی دنیا کے حاکموں سے نہ کہہ سکتے تھے وہ فریاد ان روحانی بادشاہوں تک بے تکلف پہنچا سکتے تھے۔

آج ۔۔۔۔۔۔ فاشٹ قوتیں زور پکڑ رہی ہیں، مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان نفرت وعداوت پیدا کر رہی ہیں۔ اپنے مفروضات اور واہموں کو تاریخ بنا کر پیش کر رہی ہیں۔ تہذیبی جارحیت کا ذہن بنایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ آگ کو آگ سے تو نہیں بجھایا

جاسکتا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒء کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی تمہارے راستے میں کانٹے بچھائے اور جواب میں تم بھی کانٹے بچھادو تو ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ اچھا یہ ہے کہ وہ کانٹے بچھائے تو تم پھول برساؤ۔ ایک دن مخالف خود ہی ہار مان لے گا۔ یہ نسخہ مشکل ضرور ہے اور ذہن اسے قبول کرنے پر آسانی سے آمادہ بھی نہیں ہوتا مگر خانقاہ کا دیا ہوا نسخہ یہی ہے۔ اگر خانقاہ کا ادارہ (Institution) زندہ ہو جائے تو اس پر عمل کرنا کچھ بھی دشوار نہ ہوگا۔

****

****

****

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کی دستیاب مطبوعات

دین کے معاشی نظام میں محنت کی قدر و قیمت	مفتی عبدالخالق آزاد
اجتماعی مسائل کا ولی اللّٰہی حل	جناب مقبول عالم (بی اے)
شعوری تقاضے	مولانا شوکت اللہ انصاری
جدوجہد اور نوجوان	شیخ الہند مولانا محمود الحسن
اسلام کا اقتصادی نظام ایک تقابلی جائزہ	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
ولی اللّٰہی تحریک	مولانا سید محمد میاںؒ
امام شاہ عبدالعزیزؒ افکار اور خدمات	مولانا سید محمد میاں
نظام کیا ہے؟	مفتی عبدالخالق آزاد
فرد اور اجتماعیت	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
عبادت و خلافت	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
حضرت مولانا محمد الیاس کا تصور دین	مفتی سعید الرحمٰن
غلبہ دین اور عبادات	چوہدری افضل حق مرحوم
ثناء خداوندی	چوہدری افضل حق مرحوم
جدوجہد آزادی کا راہنما ادارہ	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
دینی تمدن کی تشکیل نو	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
استعماری مظالم اور ملی تقاضے	شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ
شریعت، طریقت اور سیاست	مولانا محمد الیاس دہلویؒ، مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
قرآنی دعوت انقلاب	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
دین اور حکومت	مولانا سید سلیمان ندوی
تبدیلی نظام کا ولی اللّٰہی نظریہ	مفتی عبدالخالق آزاد

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کی دستیاب مطبوعات

ولی اللّٰہی نظام فکر کی عصری اہمیت	مولانا بشیر احمد لدھیانوی
دین وحدت	مولانا سید سلیمان ندوی
ولی اللّٰہی جماعت کا انقلابی کردار اور ہماری ذمہ داریاں	مفتی عبدالخالق آزاد
آزاد قومی پالیسی کا خاکہ	مولانا سید محمد میاںؒ
عزیمت (۲)	(ادارہ)
عزیمت (۳)	(ادارہ)
مولانا سندھیؒ کا ایک اہم مکتوب	ادارہ)
جہاد کیا ہے؟	مولانا سید سلیمان ندوی
شاہ عبدالعزیز رائپوری اور ان کے جانشین	مفتی عبدالخالق آزاد
خانقاہ رائے پور	مفتی عبدالخالق آزاد
عزیمت (۴)	(ادارہ)
غلبہ دین اور اس کے اجتماعی تقاضے	مولانا مختار حسن
تقویٰ کیا ہے؟	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
دین حق اور برصغیر کا سامراجی نظام تعلیم	مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
ترقی کا مادی تصور	مفتی سعید الرحمٰن
عدم تشدد کی حکمت عملی (اسوۂ حسنہ کا ایک مطالعہ)	مفتی سعید الرحمٰن
عزیمت (۵)	(ادارہ)
تبدیلی نظام کیوں اور کیسے	مفتی عبدالخالق آزاد
ولی اللّٰہی فکر کا تاریخی تسلسل	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
اسلام اور گروہیت	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

پوسٹ بکس نمبر 938 پوسٹ آفس گلگشت ملتان